بیسوی صدی میں برصغیر میں امت مسلمہ کے دینی و فکری مسائل اور ہمہ جہتی احیائی عمل

RELIGIOUS AND INTELLECTUAL ISSUES OF THE MUSLIM UMMAH IN THE SUBCONTINENT IN THE 20TH CENTURY AND A COMPREHENSIVE REVIVAL PROCESS

شازیہ بانو*

Abstract:
The 20th Century (January 1st, 1901 to December 31st,1999) was dominated by a chain of events that heralded significant changes in the World History so as to redefine the era .This paper makes an attempt and its religious and intellectual problems in thought, simple imitation, secularism and atheism becoming considerably more common, collision of intellectual rigidity with the Islamic thoughts, sectarism, splendour of orientalistic thoughts, intolerance and violent inclination, fundamentalism, disconnection in religious thought, social astray, predominance of mind, scantiness of interpretations of Islamic law and our ulama's restoring efforts in the 20th Century.
Keywords: 20th century, Ummat-e-Muslima, state of mind, religious and intellectual problems, Ulama , reviving, Bar-e-Sagheer.

برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ

برصغیر میں مسلمانوں کے معاشرہ کا المیہ یہ رہا کہ یہاں جو غیر ملکی مسلمان آئے اور سیاسی طور پر اقتدار پر قابض ہوئے انہوں نے اس کے ساتھ ہی کلچرل امپریلزم کے ذریعہ ہندوستانی معاشرہ کو ذہنی طور پر تسخیر کر کے ان کی ذہنی صلاحیتوں کو اس بری طرح ختم کیا کہ ان کی ذہنی اپج اور جدت ختم ہو کر رہ گئی۔ مذہبی طور پر ہندوستان کے مسلمانوں پر ہمیشہ یہ اعتراض کیا جاتا رہا کہ ان کے مذہب میں ہندو رسومات داخل ہو گئی ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ خالص اور پاکیزہ اسلام سے دور ہو گئے ہیں اور اسی وجہ سے ان پر قہر الٰہی نازل ہوا ہے اور یہی وجہ ان کے زوال کی ہے ۔ ثقافتی اعتبار سے ہندوستان کے مسلمانوں نے خود کو ہمیشہ وسط ایشیاء و ایران سے کم تر سمجھا۔ اس کمپلیکس کی وجہ سے ہندوستانی مسلمان معاشرہ اپنی کوئی آزاد اور خود مختار ثقافت پیدا نہیں کر سکا اور اس کے کسی مذہبی عالم، شاعر و ادیب کو عرب و ایران کو بطور سند تسلیم نہیں کیا گیا۔ اس کلچرل امپریلزم کی وجہ سے ہندوستان کی مقامی ثقافتیں بھی

* اسسٹنٹ پروفیسر، گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین، چونگی نمبر ۱۴، ملتان

ترقی نہیں کر سکیں کیونکہ حکومتوں نے ان کی کوئی سرپرستی نہیں کی اس ثقافتی اعتبار سے یہ طویل دور حکومت بنجر و خشک رہا۔(1)

اس لیے جب ہم ماضی کے ورثہ کی بات کرتے ہیں تو تمام علم وادب جو اس دور میں پیدا ہوا تھا، موجودہ دور میں ہمارے معاشرے کی پہنچ سے دور ہے کیونکہ یہ سب فارسی زبان میں ہے اور فارسی سے ہماری واقفیت ختم ہو چکی ہے اور یہ ایک منطقی وجہ ہے کیونکہ فارسی زبان ہندوستان کی زبان نہیں تھی اس لیے یہ یہاں ترقی نہ کر سکی اور کبھی بھی حکمران طبقوں اور شہروں سے بڑھ کر عوام یا دیہات تک نہیں پہنچی اور وقت کے ساتھ یہ اس ملک سے ختم ہو گئی اور اس کا تمام علمی ورثہ ہماری نسل کے لیے بے کار ہو گیا۔(2)

ہندوستان میں جو غیر ملکی حکمران ہجرت کر کے آئے اور یہاں رہائش اختیار کی ان میں آبائی و اجدادی وطن سے ایک زبردست رومانوی تعلق قائم اور "وطن واپسی" ان کے ذہن و دماغ پر اس قدر سوار رہی کہ اس جذبہ کے تحت وہ ہندوستان کی ہر چیز سے بے گانہ رہے اور ان کے ذہن میں یہ خیال بیٹھا رہا کہ انہیں ایک دن ہجرت کر کے اپنے وطن جانا ہے۔ وہ ہندوستان کو کفر و شرک کی سرزمین سمجھتے رہے اور ہمیشہ اس بات کو ذہن میں رکھا کہ یہاں رہتے ہوئے وہ اپنے مذہب اور عقائد کو محفوظ نہیں رکھ سکیں گے، اس کا اظہار علماء کی طرف سے بار بار ہوتا بھی رہتا تھا، جو انہیں ہندوانہ رسومات پر برا بھلا کہتے رہتے تھے۔ اس لیے ان کی خواہش تھی کہ یا تو ہندوستان سے شرک ختم کر دیا جائے یا ایسے ملک میں جایا جائے جہاں ان کے عقائد کی بالادستی ہو اور انہیں چیلنج کرنے والا کوئی نہ ہو۔ جب تک وہ سیاسی طور پر طاقت ور رہے انہوں نے اپنے مذہبی عقائد کو محفوظ تصور کیا، مگر جیسے ہی ان کا اقتدار ختم ہوا انہیں یقین ہو گیا کہ ان کا مذہب ہندوستان میں محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اس ذہنی خلفشار کو بڑھانے میں علماء کا بڑا حصہ رہا اور مذہب کے زیر اثر وہ ہندوستان میں اپنی جڑیں نہیں پیوست کر سکے۔(3)

برصغیر کا مسلمان معاشرہ اس ذہنیت کی وجہ سے تاریخ میں کئی نشیب و فراز سے گذرا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس نے تاریخ سے کوئی سبق اب تک نہیں سیکھا اور یہی اس معاشرہ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

فکری جمود اور تقلید محض

قرآن انسان کے فکر و شعور کو ارتقائی طور پر بلند سے بلند کرتا رہتا ہے۔ ذہن اور فکر کو پروان چڑھاتا ہے۔ سوچ کے دروازے کھولتا ہے اور کھلے رکھتا ہے۔ آنکھ، کان اور دل کے ذریعے بصیرت حاصل کرتے رہنے پر زور دیتا ہے۔ انسانی زندگی مسائل و مصائب اور دکھوں کا مجموعہ ہے۔ امتحان اور مسائل انسان کے لیے ناگزیر ہیں۔ نئے مسائل اور نئے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن و سنت سے دلائل پیش کرنا قرآن کی تعلیمات کو دائمی بنانا ہے اور شریعت کو بالادست کرنے کے لیے فکری کوشش کرنا ہی اجتہاد کہلاتا ہے۔ قرآن و سنت کے دلائل کو چھوڑ دینا جمود ہے جس کے نتیجے میں تقلید جنم لیتی ہے۔ ہماری مادی زندگی کے قیام و بقا کے لیے جتنی ضرورت ہوا اور پانی کی

ہے، ہماری روحانی وایمانی حیات کے لیے اس سے کہیں زیادہ ضرورت قرآن وسنت میں گہرا تدبر کرنے کی ہے۔ دور نبوی سے چوتھی صدی تک لوگ کسی ایک معین مذہب کی تقلید، اسی کے اصولوں کے مطابق تخریج اور اسی کی نقل وحکایت پر جمے ہوئے نہیں تھے لیکن بد قسمتی سے اس کے بعد اجتہاد کا آفتاب غروب ہوا اور تقلید عام ہو گئی۔ (4) اس حوالے سے اقبال کہتے ہیں کہ :

"عالم اسلام پچھلے پانچ سو برس سے جمود کا شکار ہے جس نے قانون اسلام کو عملاً سرتاپا جامد بنا دیا ہے۔"(5)

لادینیت اور الحاد

جہاں تک اس لادینیت کی تحریک کا تعلق ہے تو اس تحریک نے جس قدر امت مسلمہ کو نقصان پہنچایا، شاید ہی کسی دوسری تحریک نے پہنچایا ہو۔ مذہب ہی وہ قوت ہے جس کی وجہ سے مسلمانوں میں حمیت، اخوت، مروت، اخلاص اور دیگر اخلاق حسنہ موجود ہیں۔ لادینیت کی تحریک نے سب سے زیادہ اسی قوت پر حملہ کیا اور اس کے مختلف اثرات مرتب ہوئے جس کی وجہ سے بعض لوگ کھلم کھلا تو انکار نہ کر سکے۔ لیکن وہ دین کے بارے میں تشکیک کا شکار ہو گئے۔ امت مسلمہ کو درپیش مسائل کے حل میں خانقاہی نظام یا خانقاہوں اور درباروں میں بیٹھے ہوئے مشائخ وصوفیاء وعلماء اور پیروں کا کردار کوئی اتنا موثر نہیں ہے۔ انفرادی سطح پر کوشش ضرور ہو رہی ہے لیکن اجتماعی حیثیت سے آنکھیں کھولنے، نئے راستے تلاش کرنے اور فکری و عملی میدانوں میں بھرپور جدوجہد کی ضرورت ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابتدائی ادوار کے صوفیاء نے جہاں دینی اقدار و روایات کے فروغ اور باطل نظریات کے رد میں بھرپور کردار ادا کیا تھا وہاں آج کے پیران طریقت نے اپنے آپ کو انفرادی اصلاح وفلاح کے دائرے میں محدود کر لیا ہے جس کا واضح نتیجہ یہ نظر آتا ہے کہ نئے پیش آمدہ مسائل کا سامنا کرنا اور پھر انہیں حل کرنے کے لیے اپنے سارے وسائل لگا دینا بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔(6)

اس تحریک نے انسان کو ایک ایسی اندھی مشین بنا دیا جو روح رکھتی ہے نہ دل اور نہ عقیدہ۔ اس نے پوری دنیا کو ایک قمار خانہ یا بوچڑ خانہ بنا دیا ہے اور پوری زندگی کو خرید وفروخت یا لین دین کی منڈی بنا دیا ہے۔ اس نے زندگی سے ندرت، جدت، تنوع، گہرائی اور حرارت سلب کر لی ہے۔ اس تحریک نے عصر حاضر کے انسان کو کولہو کا بیل بنا دیا ہے جو مسلسل ایک دائرے میں چکر کاٹتا رہتا ہے اس نے انسان سے اس کی سب سے بیش قیمت متاع چھین لی ہے اور اسے سب سے بڑی شرافت سے محروم کر دیا اور وہ ہے ایمان ویقین، بے لوث اخلاص، پاکیزہ محبت اور درد وسوز کی لذت۔(7)

ڈاکٹر غلام جیلانی (۱۹۰۱ء۔ ۱۹۸۵ء) تحریک مادیت کے انہی اثرات کا جائزہ یوں لیتے ہیں کہ عصر رواں میں انسان کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس کا نقطہ نگاہ مادی ہو چکا ہے مادیت سے مراد خود پرستی، لالچ، حسد، نفرت،

عداوت اور بد دیانتی ہے انسان کے اجتماعی اور انفرادی مصائب کا سبب یہی دماغ ہے نتیجہ یہ نکلا کہ روحانیت مادیت سے بمراحل پیچھے رہ گئی۔ (8)

مذہبی اور لادینی نظریات کا فکر اسلامی سے تصادم

اہل مغرب نے مذہب کو انفرادی زندگی تک محدود کرنے پر زور دیا ہے، اہل اسلام کے ہاں بھی ایسے ہی تصورات کو زبردستی ٹھونسا جارہا ہے۔

جس وجہ سے مسلمان اسلام کے اجتماعی فلاح کے پہلو کو نظرانداز کر رہے ہیں۔ دوسری طرف صوفیاء کا رویہ بھی واضح ہے، وہ مذہب کو نجی زندگی کے محدود تصور تک مقید کیے ہوئے ہیں۔ نتیجۃً لادینی نظریات کا فکر اسلامی سے ٹکراؤ ہو رہا ہے اور اس کا اثر و رسوخ بڑھتا جارہا ہے۔ (9)

اس حوالے سے مذہب فطرت کا مبلغ ٹورالبا (Toralba) کہتا ہے:

> "جب لوگوں نے اس فطری مذہب کو ترک کر دیا جو عقل کے ساتھ ان کی طبیعت میں ودیعت کیا گیا، تو وہ گمراہ ہو گئے، فطری قانون اور فطری مذہب انسان کے لیے کافی ہے۔ اسکے علاوہ تمام مذاہب کے بغیر کام چل سکتا ہے۔" (10)

فرقہ پرستی

آج ایک مسلمان دوسرے مسلمان سے باہم دست و گریباں اور معاشرتی مقاطعے جیسے رویوں کو اپنائے ہوئے ہے۔ اسلام نے جس قدر فرقہ پرستی کی مذمت کی ہے آج کا مسلمان اسی قدر اسے باعث فخر سمجھے ہوئے ہے۔ علامہ اقبال نے اس فرقہ پرستی پر تنقید کرتے ہوئے فرمایا تھا:

کہیں فرقہ بندی ہے اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں (11)

فرقہ پرستی کے اس دور میں جہاں باقی انسانی طبقات غیر موثر اور غیر اہم کردار ادا کر رہے ہیں وہاں ہر گروہ، خواہ اس کی تنظیم سیاسی، سماجی یا مذہبی بنیادوں پر ہو، وہ گروہ بندی اور اتحاد و اتفاق کی فضا کو مکدر کر رہا ہے۔ صوفیاء اور علماء بھی اس فکری و عملی انتشار میں برابر کے حصے دار ہیں تصوف کے مختلف سلسلے خود ایک نظریے اور عمل پر متفق نہیں ہیں بلکہ ایک سلسلے سے منسلک افراد دوسرے سلسلوں کو غلط اور غیر اہم سمجھتے ہیں۔ (12)

متجددانہ نظریات کا فروغ

اسلامی ماخذ کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرنے میں ایک بڑا حصہ ان غیر مسلم مغربی علماء (مستشرقین) کا ہے۔ جنہوں نے اسلام کے مطالعے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ مستشرقین اسلامی

موضوعات، قرآن، وحی، حدیث، رسالت، سیرت، تاریخ، سیاست، خلافت راشدہ اور اسلام کے پیش کردہ مختلف نظاموں کے بارے میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر اسلام سے ناآشنا اور محدود مطالعہ رکھنے والے عام مسلمان اسلام اور یقین سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ان کی کتب میں اس قدر لطیف طریقے سے فریب آمیز مواد پایا جاتا ہے جو ایک ذہن اور حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو، اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ یہ مستشرق اپنے طریق کار اور ارادوں کو ہمیشہ خفیہ رکھتے ہیں اور موقع بہ موقع بدلتے رہتے ہیں۔المیہ یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی رسائی اسلام کے بنیادی ماخذ تک نہیں ہے بلکہ ان کی رسائی مستشرقین کے پیش کردہ ماخذ تک ہے۔(13)

بیسویں صدی میں غیر مسلموں کی اسلام کے خلاف چلائی جانے والی انہی مہمات کے نتیجے میں اسلامی معاشرہ جدید دور میں ذہنی انتشار کا شکار رہا۔ یہ عالم کفر کی مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش ہے۔ان تمام کاروائیوں کو غیر موثر بنانے اور مستشرقین کے مذموم نظریات کے راستے میں رکاوٹ بننے کے حوالے سے مسلمان علماء وصوفیاء نے ناقص حکمت عملی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی قابل قدر خدمات سرانجام نہیں دیں۔

دین ودنیا کی تفریق (اسلام کی جزوی دعوت)

سب سے بڑی مشکل دین ودنیا کی تفریق کا یہ تصور ہے یہ صرف ذہن کی حد تک محدود نہیں بلکہ اس کا زہر خون میں مل کر پورے جسم میں گردش کر رہا ہے۔اس نے سوچنے کے انداز سے لے کر عمل کی جزئیات تک کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا ہے۔دین کا یہی مفہوم یورپ میں چرچ کا ہے، یعنی دین بندے اور خالق کے درمیان نجی تعلق ہے۔(14)

مولانا مودودیؒ (۱۹۰۳ء۔۱۹۷۹ء) اس تفریق کے بارے میں فرماتے ہیں کہ نظام جسمانی سے الگ ہو جانے کے بعد قلب بے کار ہو جاتا ہے اسی طرح زندگی سے بے تعلق ہو جانے کے بعد عقائد اور عبادات کی بھی کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔(15)

دین ودنیا کی اس تفریق کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں نے صرف اسلام کی بعض جزئیات پر عمل کرنا شروع کر دیا اور اکثر دینی معاملات کو ترک کر دیا اور یہ وہی چیز ہے جیسے قرآن میں اہل کتاب کی خرابی کے طور پر بیان کیا گیا ہے فرمایا:

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ(16)

ترجمہ: (کیا تم کتاب کے کچھ حصے پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو۔)

بنیاد پرستی

مسلم دنیا پر آج اسلامی بنیاد پرستی کا الزام لگایا جارہا ہے۔ کمیونزم کے خاتمے سے پیدا شدہ خلا ایک نئے نام نہاد دشمن، جس کا نام "اسلامی بنیاد پرستی" رکھا گیا ہے، سے پر کیا جارہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف یورپ ہی نہیں بلکہ تمام مغربی دنیا کے اعصاب پر یہ خطرہ ڈراؤنے خواب کی طرح سوار ہو گیا ہے۔ امریکہ میں تو اسلامی بنیاد پرستی کو مستقبل کا خطرہ قرار دے دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج یورپ اور امریکہ عالم اسلام کو ہر محاذ پر شکست دینے اور مسلمانوں کو ہر میدان میں نیچا دکھانے کے لیے کوشاں ہیں۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے لے کر آج تک امت مسلمہ بڑے کٹھن حالات سے گزر رہی ہے۔(17)

دینی فکر میں اختلال

دینی فکر میں اختلال کا بنیادی سبب یہ ہے کہ مذہبی ذہن بدلنے والی اقدار کو نہ بدلنے والی اقدار منوانے پر مصر ہے۔

ہم نے اپنے دینی فکر میں اختلال کا تدارک کرنے کے لیے پاکستان کا مطالبہ کیا تھا اور ضرورت یہ تھی کہ ہم اپنی حیات اجتماعی کے سرچشموں (کتاب، سنت، اور تاریخ اسلام) سے ولولہ اخذ کر کے موثرات اختلال کا تدارک کریں۔ اور اختلال انگیزی کے موثرات کے جواب میں قومی کردار کی حفاظت کر سکیں مگر کتاب، سنت، اور تاریخ اسلام کی نسبت ہمارے تصورات مسخ ہو چکے تھے۔ ہم نے اپنے دور زوال کے شکست خوردہ ذہن کے ساتھ کتاب و سنت اور تاریخ اسلام کے جو تصورات وضع کئے تھے، ان میں حیات بخشی کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہ گئی تھی ۔ مثلاً:

1۔ ہمارا ذہن غایت نزول قرآن کے باب میں التباس کا شکار ہو جاتا ہے۔

2۔ سنت اور اسوہ مبارک کی، جو غایت بعثت کو پانے کی جدوجہد کی مظہر ہے، پیروی سے زیادہ ہمارے حق میں کوئی اور چیز مفسر نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہماری آرزو مقصود بعثت کو حاصل کرنے کے بجائے، بین الاقوامی زندگی میں مسلمانوں سے اتحاد کے بجائے دشمنان اسلام سے سازگاری بن گئی تھی۔

3۔ تاریخ اسلام کی نسبت ہم نے یہ رائے قائم کی تھی کہ اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ اسلام سے انحراف، انکار، سرکشی اور بغاوت کی تاریخ ہے، کیونکہ خلافت راشدہ کے فوراً بعد سے (بقول ہمارے بعض خود ساختہ مصلحین امت کے) اسلام کی اجتماعیت کی زمام جاہلیت کے ہاتھ میں منتقل ہو گئی ہے۔(18)

حاسّۂ مذہبی کا فقدان

برصغیر کے مسلمانوں کا ایک المیہ یہ بھی رہا کہ ان میں حاسّۂ مذہبی کا فقدان رہا۔ برصغیر کے مسلمانوں میں حواس ظاہری کے علاوہ ایک اور حاسّۂ بھی رہا ہے جس کو ہم حاسّۂ مذہبی کہہ سکتے ہیں۔

مذہبی حاسّہ سے محروم لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ(19)

اس زمانہ کا اصلی مرض دراصل دین کے بارے میں بے حسی و بے طلبی اور مذہبی سوالات کے بارے میں کامل بے تعلقی اور بے نیازی ہے۔ جس کا علاج سب سے زیادہ مشکل ہے اور جس کی موجودگی میں کوئی مذہبی دعوت و تلقین کارگر نہیں ہو سکتی مذہب و اخلاق کی دعوت کو فسق و فجور اور معصیت و غفلت کے تاریک دور اور انکار و مخالفت کے پُرشور سے پُرشور عہد میں وہ مشکلات پیش نہیں آئیں جو مذہب سے بے تعلقی و بے نیازی کے اس خاموش و پر سکون دور میں پیش آ رہے ہیں کیونکہ پہلے مذہبی سوالات پیدا ہوتے تھے، ممکن ہے ان کا تشفی بخش جواب نہ ملتا ہو لیکن اس زمانہ کی ایک نمایاں خصوصیت یہ رہی کہ یہ سوالات سرے سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔(20)

ہندوستان کی اخلاقی حالت اور معاشرتی انارکی

باعث حیرت و استعجاب حقیقت جو ہندوستانیوں کی زندگی میں مشترک تھی وہ ان کی اخلاقی پستی، جنسی بے راہ روی اور سفلی خواہشات کی غلامی ہے۔ اس طرح وہ لوگ فکری بلندی اور اخلاقی پستی کا نمونہ بنے ہوئے تھے اور اس بداخلاقی سے فلسفیانہ غور و فکر، علمی فتوحات کی لذت اور اخلاقی اقدار بھی نہیں روک سکتی تھیں۔(21)

اس حوالے سے ہندو مورخ ودیادھر مہاجن لکھتے ہیں کہ:

> "اخلاقی انحطاط آخری نقطہ پر پہنچ گیا تھا اور مندروں تک فحاشی پھیل گئی تھی اور یہ کوئی عیب کی بات بھی نہ رہی تھی کیونکہ اسے عبادت کا رنگ دے دیا گیا تھا۔ عوام محنت سے جی چرانے لگے تھے اور اپنا وقت رنگ رلیوں میں صرف کرتے تھے۔۔۔ وہ شراب نوشی، گوشت خوری اور عورتوں سے لطف اندوزی میں مست تھے یہ خرابیاں علمی درسگاہوں تک سرایت کر چکی تھیں مندروں میں دیوداسیوں کا رواج عام تھا۔ فحش لٹریچر نے لوگوں کے اخلاق پر برا اثر ڈالا تھا"(22)

معاشرتی بے راہ روی اور ذہنی استیلاء

بیسوی صدی عیسوی کا ایک المیہ معاشرے میں اعتقادی اور عملی گمراہیوں اور بے راہ روی کا پوری طرح سرایت کر جانا تھا اس کا اصل سبب صدیوں کے بتدریج انحطاط و اضمحلال اور خاص طور پر انگریزوں کے دور غلامی اور خدانا آشنا مغربی افکار و نظریات اور تہذیب کے ذہنی استیلاء کی وجہ سے ہمارے ایمان میں ضعف کا پیدا ہو جانا اور دین کی حقیقی تعلیم و حکمت سے دور ہو جانا ہے۔ یہی ضعف ایمان اور دین سے بُعد ہی ہماری تمام خرابیوں کی اصل جڑ ہے اور اس جڑ سے خرابیوں کی بے شمار شاخیں پھوٹ نکلیں۔(23)

دو متصادم ثقافتیں

بارہ طویل صدیوں تک اسلام ہندوستان میں ہندومت کے ساتھ ساتھ رہا۔ بارہ صدیوں تک دونوں قومیں ایک دوسرے کے مد مقابل رہیں۔ عقائد کی تفریق کے علاوہ ایک جانب قومیتی اولعزمیاں اور دوسری جانب قومیتی تحفظ کے فطری جذبے کی آویزش، اکثر و بیشتر چپقلشوں اور تنازعوں کا سبب بنی رہی اور آج تک جاری ہے۔ (24)

ہندو ہمیشہ سے روحانی طور پر قانون شکن (انارکسٹ) رہا ہے اس کے عقیدہ کی نوعیت ذاتی اور انفرادیت پسندانہ رہی ہے۔ جبکہ اسلام مذہبی و معاشرتی مساوات اور فلاح کل کا علمبردار ہے۔

علماء کرام کی فرقہ پرستی اور اجتہاد کا فقدان

برصغیر میں بیسویں صدی کے حوالے سے علماء کرام کی خدمات دو اعتبار سے اصلاح طلب رہیں۔ ایک یہ کہ جب سے اجتہاد کا دروازہ بند ہوا اور تقلید جامد کا دور دورہ ہوا اور تشتت و انتشار اور فرقہ پرستی و گروہ بندی نے پاؤں جما لیئے، ہر فرقہ کے علماء کرام دین کے نظام عقائد و اعمال کی خاص اسی صورت کی حفاظت و مدافعت پر سارا زور صرف کر رہے ہیں جو ان کے مخصوص فرقے یا گروہ کے نزدیک معتبر و مستند ہے۔ جس سے فرقہ بندی کی جڑیں مضبوط تر ہوتی چلی جا رہی ہیں۔ دوسرے چونکہ انہوں نے علوم جدیدہ اور دور حاضر کے افکار و نظریات کا مطالعہ اس طرح براہ راست اور بالاستیعاب نہیں کیا۔ جس طرح اپنے اپنے دور میں امام غزالیؒ اور امام تیمیہؒ نے کیا تھا لہٰذا وہ دور حاضر میں حفاظت و مدافعت دین کے اصل تقاضوں کو بھی صحیح طور پر پورا کرنے سے قاصر ہیں۔ گویا دور حاضر میں علماء دین کی حیثیت دین کے جہاز کو آگے بڑھانے والی قوت فراہم کرنے والے انجن کی تو نہیں ہے البتہ کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک ایک ایسے بھاری لنگر کی ضرور ہے جو اس کشتی کو غلط رخ پر بڑھنے سے روکنے کی خدمت بہر حال سرانجام دے سکتا ہے۔ (25)

بیسوی صدی عیسوی میں ہمہ جہتی احیائی عمل کے مراحل

- برصغیر میں بیسویں صدی میں اس احیائی عمل کا اولین مرحلہ مسلمان اقوام کا مغربی استعمار کے براہ راست تسلط سے نجات کا حصول تھا جو بحمد اللہ گذشتہ ساٹھ ستر سال کے دوران تقریباً مکمل ہو چکا ہے۔ اگرچہ اب بھی ہم مغرب کی علمی و فکری اور تہذیبی و ثقافتی غلامی میں مبتلا ہیں اور اقوام مغرب کی سائنسی اور تکنیکی بالا دستی کے باعث بہت سے پہلوؤں سے ان کے دست نگر بھی ہیں البتہ وحدت ملی کا تصور اس صدی کے آغاز تک برقرار تھا لیکن اس صدی کے ربع اول کے دوران مغربی استعمار کے ہتھکنڈوں نے اسے بھی ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ (26)

- اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا دوسرا اہم گوشہ وہ ہے جس میں علمائے کرام کی مختلف جماعتیں اور تنظیمیں سرگرم کار اور اپنے اپنے مخصوص انداز میں اسلام اور مسلمانوں کی خدمت میں مصروف و مشغول ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس پہلو سے بھی برصغیر ہندو پاک کو پورے عالم اسلام میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے، چنانچہ علماء دین کو جس قدر اثر و رسوخ یہاں کے مسلمان عوام پر حاصل ہے وہ دنیا میں کہیں اور نظر نہیں آتا اور راسخ العقیدہ اسلام جتنی مضبوط جڑیں یہاں رکھتا ہے کہیں اور نہیں رکھتا۔ (1968ء میں جو ایجی ٹیشن ڈاکٹر فضل الرحمن مرحوم کی کتاب "اسلام" کے خلاف ہوا تھا اور پھر 1974ء میں جو معجزہ قادیانی مسئلے کے حل کی صورت میں صادر ہوا وہ اس کے منہ بولتے ثبوت ہیں)۔

اس ضمن میں یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ علماء دین کی مساعی میں اصل زور دور حاضر میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ اور تجدید و احیائے دین کے تقاضوں کو پورا کرنے کے بجائے دین کے نظام عقائد و اعمال کی حفاظت و مدافعت پر ہے۔ (27)

اس طرح ان کی خدمات کو سابق مجددین اسلام کی مساعی کے ساتھ ایک نوع کے تسلسل کی نسبت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے دور تک تمام مجددین امت علیہم الرحمۃ کی مساعی اکثر و بیشتر علم و فکر کے میدان ہی تک محدود رہیں اور عقائد و نظریات کی تصحیح و اصلاح ہی کو ان کے اصل ہدف کی حیثیت حاصل رہی اور اس سے آگے اگر قدم بڑھا بھی تو زیادہ سے زیادہ اصلاح اخلاق و اعمال، تزکیہ نفس اور تربیت روحانی تک اس سے آگے بڑھ کر گذشتہ صدی میں کسی بھی مجددین کی جدوجہد نے سیاسی یا عسکری تحریک کی صورت اختیار نہیں کی۔ (28)

- بیسویں صدی عیسوی کے اس ہمہ جہتی احیائی عمل کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرپیکار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئی اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برعظیم ہندو پاک ہی کو حاصل ہے۔ برعظیم میں اس تحریک احیائے دین کے موسس اولین اور داعی اول کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد (1888ء۔1958ء) کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے "حکومت الہیہ" کے قیام اور اس کے لیے ایک "حزب اللہ" کی تاسیس کی پرزور دعوت پیش کی۔ (29)

ایک عالم دین، صاحب علم اور ہندوستان کے وزیر تعلیم ہونے کے وقار کے ساتھ ساتھ ابو الکلام (1888ء۔1958ء)، دیوبند کے نیشنلسٹ علماء اور آزاد طبع جدت پسندوں کے درمیان جن میں اے۔اے۔

اے فیضی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے علماء مثلاً ڈاکٹر ذاکر حسین، محمد مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین شامل و ممتاز تھے، پُل کا کام انجام دے رہے تھے۔(30)

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی (1903ء۔ 1979ء) نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں مرحوم قرار دے کر ترک کردہ مشن کو اختیار کرنے کے عزم مصمم کے ساتھ ان کی تفسیر "ترجمان القرآن" ہی کے ہم نام ماہنامے کی ادارت سنبھالی اور اس کے ذریعے اسی "حکومت الہیہ" کے قیام کا نصب العین اور "تجدید واحیائے دین" کی سعی کا ایک نقشہ مسلمانان ہند کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا اور پہلے چھ سات برس تک پورے صبر و استقلال کے ساتھ خالص انفرادی طور پر کام جاری رکھا۔ پھر کچھ عرصہ "دارالاسلام" کے نام سے جو ادارہ علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند چوہدری نیاز علی خان نے قائم کیا تھا اس کے تحت کام کیا اور بالآخر 1941ء میں "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک جماعت کی بنیاد رکھ دی اور ایک منظم جدوجہد کا آغاز کر دیا۔

صدیوں سے عالم اسلام میں علمی و ثقافتی مراکز دو ہی رہے ہیں: عالم عرب میں مصر اور غیر عرب مسلم دنیا میں ہندوستان۔ چنانچہ بیسویں صدی عیسوی کی احیائی تحریکیں بھی ان ہی دو ملکوں سے اٹھیں۔(31)

ممتاز محقق سید قاسم محمود اسلام کے احیائی عمل کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

> ''احیائے اسلام کی تاریخ کے آسمان پر یہ سب ستارے اپنے اپنے ملکوں اور علاقوں میں جگمگاتے ہوئے صاف صاف نظر آتے ہیں لیکن یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ سب جمال الدین افغانی (1838ء۔ 1897ء) کے آفتاب تازہ سے روشنی حاصل کر رہے ہیں کسی بھی ملک کی احیائی اسلامی تحریک کے تذکرے سے پہلے چاہیے کہ سید افغانی اور ان کی تحریک اتحاد اسلامی کا ذکر ہو، تمام حالیہ اسلامی تحریکوں کی ماں سید افغانی کی پان اسلام ازم کی تحریک ہے۔''(32)

اسی حوالے سے علامہ اقبال (1877ء1938ء) لکھتے ہیں کہ:

> "زمانہ حال میں میرے نزدیک اگر کوئی شخص مجدد کہلانے کے مستحق ہیں تو وہ صرف اور صرف جمال الدین افغانی ہیں"(33)

برصغیر کی نمایاں شخصیات میں سے سب سے پہلے شبلی نعمانی کو ان کے پیرو کار بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور یوں وہ "دبستان افغانی" کی ہندوستانی شاخ کے سربراہ بن گئے۔

گویا شبلی کی ذات سے چار سلسلوں کا آغاز ہوا۔ ان میں سے پہلا سلسلہ سیرت رسول، احادیث و سنت، تاریخ اسلام اور سوانح نگاری میں دلچسپی رکھتا تھا دوسرا سلسلہ تقابل ادیان اور مذہب و سائنس کے تقابلی مطالعے میں دلچسپی رکھتا تھا، تیسرے سلسلہ کے لوگ عمرانیات و سیاسیات سے شغف رکھتے تھے اور چوتھے سلسلے کو قرآنیات سے

دلچسپی تھی۔ پہلے سلسلے کا آغاز سید سلیمان ندوی۔(1884ء۔1953ء) سے ہوتا ہے ان کے جانشین ابوالحسن علی ندوی(1914ء۔1999ء) قرار پائے۔ عبدالماجد دریا آبادی(1892ء۔1977ء) تقابلی ادیان اور مذہب و سائنس کے تقابلی مطالعہ میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان کے جانشین احمد حسین دیدات(1918ء۔2005ء) ہوئے سیاسیات و عمرانیات کے میدان میں ابوالکلام آزاد کی جانشینی کا حق ابوالاعلیٰ مودودی نے ادا کیا۔ اور حمید الدین فراہی(1863ء۔1930ء) کے جانشین امین احسن اصلاحی ہوئے۔ ابوالحسن ندوی کے دیوبند فرقہ میں شامل ہونے کے بعد ان کے اپنے حلقہ میں تو کوئی ایسا پیدا نہ ہوا جو سیرت اور احادیث و سنت پر دبستان شبلی کے اصولوں کے مطابق تحقیق کرتا لیکن دریا کے اس کنارے پر ڈاکٹر حمید اللہ نے اس سلسلہ کو انتہائی شاندار طریقے سے آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کے جانشین ڈاکٹر محمود احمد غازی(1950ء۔2010ء) تھے۔ یہی معاملہ دوسرے سلسلہ کے ساتھ بھی ہوا۔ عبدالماجد دریا آبادی کے دیوبندی فرقہ میں شامل ہونے کے بعد ان کے اپنے حلقہ میں کوئی ایسا شخص پیدا نہ ہوا جو اس سلسلہ کو آگے بڑھاتا لیکن بمبئی میں شیخ احمد حسین دیدات جیسا مفکر پیدا ہوا جنہوں نے تقابل ادیان کے اس سلسلے کو شاندار انداز سے آگے بڑھایا۔ شیخ احمد حسین دیدات کی وفات کے بعد ان کی نشست وحید الدین خان نے سنبھالی۔ وہ ابوالاعلیٰ مودودی، امین احسن اصلاحی اور ابوالحسن ندوی تینوں سے فیض یاب ہوئے۔ (34)

اسی دوران ایک اور نوجوان محقق منظر عام پر آئے جو تقابل ادیان میں کمال کی حدوں تک پہنچے ہوئے ہیں نیز اسلام اور سائنس کے تقابلی مطالعہ پر بھی ان کی گرفت بہت گہری ہے اس نوجوان کا پورا نام ڈاکٹر عبدالکریم نائیک(1965ء پیدائش) ہے اور لوگ انہیں ڈاکٹر ذاکر نائیک کے نام سے پہچانتے ہیں ڈاکٹر صاحب بنیادی طور پر طب کے شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن طالب علمی کے زمانے میں وہ شیخ احمد حسین دیدات سے متاثر ہو گئے۔ جس کی وجہ سے وہ دنیائے طب کو الوداع کہہ کر دینیات کے میدان میں چلے آئے۔ انہوں نے مذاہب کے تقابلی مطالعہ پر مبنی اعلیٰ کتابیں بھی لکھیں اور دن رات احیائے اسلام کے لیے اپنے کام میں مگن ہیں۔ (35)

ابو الاعلیٰ مودودی کے حقیقی جانشین ڈاکٹر اسرار احمد تھے۔ 1957ء میں جماعت اسلامی جس کام سے دستبردار ہو گئی تھی، ڈاکٹر اسرار احمد نے اس کا بیڑا اٹھایا۔ 1966ء میں انہوں نے امین احسن اصلاحی کے جاری کردہ رسالہ "میثاق" کی ادارت سنبھالی۔ 1967ء میں تحریک "رجوع الی القرآن" کا آغاز فرمایا۔ 1972ء میں "انجمن خدام القرآن" قائم کی۔ 1975ء میں انقلابی طریق کار کے ذریعہ حکومت الہیہ قائم کرنے کے لیے "تنظیم اسلامی" بنائی، 1977ء میں لاہور میں مرکزی قرآن اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا گیا بعد ازاں پورے پاکستان میں قرآن اکیڈمیوں کا جال بچھا دیا۔ 1987ء میں قرآن کالج قائم کیا۔ 1991ء میں "تحریک خلافت پاکستان" کے نام سے ایک عمومی تحریک کا آغاز کیا۔ ان کی کامیابیوں میں سے ایک بڑی کامیابی یہ بھی ہے کہ جماعت اسلامی کے

وہ اراکین جنہوں نے 1957ء کے مشہور زمانہ اجتماع ماچھی گوٹھ میں انتخابی طریقہ کی حمایت کی تھی۔ وہ 1993ء میں نعیم صدیقی کی قیادت میں جماعت اسلامی سے علیحدہ ہو کر "تحریک اسلامی" کے نام سے منظم ہوئے اور انقلابی راستے پر گامزن ہو گئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بعد، اس سلسلہ کے نمائندہ احمد جاوید ہوں گے جو بچپن اور جوانی میں ابوالکلام آزاد اور ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر اثر رہے اور حکومت الہیہ کے قیام کے پرزور حامی ہیں البتہ احمد جاوید کو تین بڑے چیلنج درپیش ہیں۔

- اول یہ کہ انہیں روشن خیالی کے کم از کم اس مقام کو برقرار رکھنا ہے جس پر ابوالکلام فائز تھے۔
- دوم یہ کہ بیسویں صدی میں ابوالاعلیٰ مودودی نے کتاب وسنت کے اصولوں کی روشنی میں اسلام کے سیاسی، معاشی، معاشرتی، روحانی اور اخلاقی نظام کا جو ڈھانچہ تشکیل دیا تھا، اس کا بیشتر حصہ قصہ پارینہ کی مانند ہو چکا ہے، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اکیسویں صدی کے احوال و ظروف کے مطابق جدید تحقیقات کی روشنی میں اس ڈھانچے کو از سر نو تشکیل دیا جائے۔
- سوم یہ کہ ڈاکٹر اسرار احمد کے قدامت پسندوں کی طرف جھکنے سے اس فکر پر جو منفی اثرات مرتب ہوئے ان کا ازالہ کرنا ہے

یہ تینوں بہت بڑے چیلنج ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی صلاحیتیں انہیں عطا کی ہوئی ہیں، ان کی بناء پر ان چیلنجوں سے نمٹنے میں انہیں کامیاب کرے۔ آمین (36)

حمید الدین فراہی چوتھے سلسلے کے بانی تھے ان جیسی تحقیقی ذوق رکھنے والی شخصیات صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ قرآنیات میں دلچسپی رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال تحقیق کی وادی خموشاں میں گذارے۔ ان کے بعد امین احسن اصلاحی نے جماعت اسلامی سے علیحدہ ہونے کے بعد سے اپنی وفات تک چالیس سال تحقیق کی دنیا میں بسر کیے۔ جاوید احمد غامدی گذشتہ تیس سالوں سے اِسی وادی نجد میں شور سلاسل بلند کیے ہوئے ہیں۔ یہ مجموعی طور پر ایک سو دس سال بنتے ہیں۔ اس قسم کی مضبوط تحقیقی روایت برصغیر میں دوسری جگہ نظر نہیں آتی دوسرے لوگ اتنے ہی سال ان سے پیچھے ہیں۔ امین احسن اصلاحی تحقیق میں مگن رہنے کے ساتھ ساتھ دعوت و تحریک کی طرف بھی متوجہ ہوئے۔ چنانچہ 1930ء کی دہائی میں انہوں نے تحریک تدبر قرآن کا آغاز فرمایا۔ ابوالکلام آزاد کی ''تحریک دعوت قرآن'' کے بعد قرآن کے نام پر اٹھنے والی یہ برصغیر کی دوسری تحریک تھی۔ 1936ء میں انہوں نے ماہ نامہ ''الاصلاح مردودی'' جاری کیا اور "دائرہ حمیدیہ" قائم کیا۔ وہ مزید اقدامات کے حوالے سے ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ پٹھان کوٹ سے ابوالاعلیٰ مودودی کی دعوت ان کے کانوں میں پڑ گئی اور یوں وہ تحریک تدبر قرآن، مدرسۃ الاصلاح، ماہ نامہ الاصلاح اور دائرہ حمیدیہ دیگر احباب کے سپرد کر کے خود، غامدی صاحب کے الفاظ میں "فراہی کی خانقاہ سے ابوالاعلیٰ کے دارالسلام میں پہنچ گئے" (37)

کچھ اسی طرح کی کشمکش مولانا امین احسن اصلاحی (1904ء۔1997ء) اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے نصب العینوں میں بھی دیکھنے میں آئی اور 1947ء سے 1957ء تک دس سال تک ان کے درمیان "سرد جنگ" جاری رہی۔ دراصل امین احسن اصلاحی چاہتے تھے کہ پٹھان کوٹ کے دارالسلام کے طرز پر پورے پاکستان میں "جدید خانقاہوں" کا جال بچھایا جائے تاکہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی دینی تربیت کی جا سکے جیسا کہ دارالسلام پٹھان کوٹ میں کی جاتی رہی تھی۔ نیز تربیتی اداروں کے علاوہ چند تحقیقی ادارے قائم کیے جائیں۔ اس کے برعکس ابو الاعلیٰ کا خیال تھا کہ آئین سازی کے اس اہم موقع پر اگر ہم نے آگے بڑھ کر لادینیت اور اشتراکیت کے حدی خوانوں کے ہاتھ نہ تھامے تو پاکستان کا حال مصطفیٰ کمال کے ترکی سے مختلف نہ ہوگا۔ ایک مرتبہ متفقہ آئین تشکیل پانے کے بعد اس کو تبدیل کرنا خونی انقلاب کے بغیر ممکن نہ ہوگا اور خونی انقلاب خود نبی ﷺ کے منہج کے خلاف ہے۔ لہٰذا علمی و تحقیقی، دعوتی و تربیتی اور تبلیغی سرگرمیوں کے سربراہ امین احسن اصلاحی تھے اور ان کا ساتھ ڈاکٹر اسرار احمد (1932ء۔2010ء) دے رہے تھے جبکہ سیاسی سرگرمیوں کے حامی گروہ کے سربراہ ابوالاعلیٰ مودودیؒ تھے اور ان کا ساتھ نعیم صدیقی دے رہے تھے۔ بالآخر 1957ء میں یہ کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور ماچھی گوٹھ میں ارکان جماعت کا اجتماع طلب کیا گیا ان کے سامنے دونوں گروہوں نے اپنی اپنی تجاویز رکھیں۔ جماعت کے ارکان کی اکثریت نے سیاسی سرگرمیوں کے حق میں فیصلہ دیا، امین احسن اصلاحی کو اس سے سخت دھچکا لگا۔۔۔ سترہ سال جماعت اسلامی میں ضائع کرنے کے بعد اپنی تحریک کی طرف دوبارہ متوجہ ہوئے۔[38]

بیسویں صدی میں قرآن اور اسلام کے نام پر جتنی بھی تحریکیں اٹھیں، ان میں شبلی کی تحریک کے علاوہ باقی سب تحریکوں نے عوام اور خواص کو مخاطب کیا اور ان تحریکوں کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی ہے اس کے برعکس شبلی اور امین احسن نے صرف اخص الخواص کو ہی اپنی بارگاہ میں بیٹھنے کی اجازت دی۔ یہ طریقہ انہوں نے یورپ کی جدید تحریکوں کو سامنے رکھ کر اخذ کیا تھا۔[39]

امین احسن اصلاحی نے بھی اپنی تحریک کی بنیاد اسی اصول پر رکھی کہ عوام و خواص کا غول جمع کرنے کے بجائے دس پندرہ باصلاحیت نوجوانوں کی صحیح تربیت کی جائے چنانچہ سب سے پہلے انہوں نے باصلاحیت نوجوانوں کی تلاش میں حلقہ ہائے تدبر قرآن قائم کیے۔ اگلے مرحلے میں انہوں نے حلقہ ہائے تدبر قرآن کے شرکاء کو رخصت دے کر صرف چند نوجوانوں کو اپنے پاس رکھا اور تربیت شروع کر دی تیسرے مرحلہ میں ادارہ تدبر قرآن قائم کر کے اس تحریک کو باقاعدہ انسٹیٹیوشنلائز کیا۔ ابوالکلام کے "دارالارشاد" اور ابوالاعلیٰ کے "دارالاسلام" کے طرز پر قائم ہونے والے اس ادارے کا قیام 1973ء میں عمل میں لایا گیا۔[40]

بہر کیف برصغیر میں احیائے دین اور غلبہ اسلام کے کارواں کو منظم کرنے اور اسے کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے درج ذیل امور خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

- باطل کی قوت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگایا جائے اور اس کی بنیادوں پر ایک بہترین حکمت عملی اور کامیاب منصوبہ بندی کے ساتھ حملہ کیا جائے۔
- منصوبہ بندی میں اس بات کا خیال رکھا جائے کہ یہ منصوبہ بندی ہمہ جہت ہو اور مختلف پروگرام منتہائے مقصود تک پہنچنے میں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوں نیز اراکین کو اس جامع منصوبہ بندی کی واقعی بصیرت اور حقیقی ادراک ہو تاکہ وہ اپنے پروگرام کے ہر جز کی اہمیت سے واقف ہوں اور انقلاب اسلامی کی جدوجہد میں ایقان کا رنگ رچ بس سکے۔
- دعوت کا رخ کسی خاص طبقے کے بجائے ساری انسانیت کی طرف ہو اور خطاب کسی خاص گروہ کے بجائے الناس سے کیا جائے یعنی اسلام کی دعوت کو سوسائٹی کے مکھن کے لیے مخصوص نہ کیا جائے بلکہ دعوت کے نتیجے میں جو لوگ اپنا سب لٹانے کے لیے اس راہ میں پیش قدمی پر آمادہ ہوں انہیں ہی مکھن قرار دیا جائے۔
- طریقہ ابلاغ و ترسیل، لب و لہجہ اور آہنگ و بیان ہر اعتبار سے عوامی ہو یعنی جو بیک وقت سوسائٹی کے ہر طبقے کے لیے قابل فہم ہو، دعوت کی حکمت و اسالیب پر فکر آخرت اور رضائے الٰہی کا داعیہ، اسلام کی سیاسی برتری، جیسے دوسرے تمام داعیات سے کہیں زیادہ غالب ہو کر یہی انبیائی مشن کے حاملین کی دعوت کا لب لباب ہے۔
- غیر مسلموں کی طرف رویہ مخالفانہ اور متحاربانہ کے بجائے ہمدردانہ اور خیر خواہانہ ہو۔ انہیں پہلے ہی سے کافر اور مخالف اسلام تصور کر لینے کے بجائے محض ایک غافل گروہ سمجھا جائے اور ان تک پیام ربانی کی ترسیل میں اسی درد کی کارفرمائی ہو جو ایک سچے مسلمان سے کسی خستہ حال غافل کے لیے مطلوب ہے یعنی اس بات کی ہر ممکن کوشش کی جائے کہ کاش یہ غافل انسانیت جہنم کے خوفناک عذاب سے بچ جائے۔
- انقلاب اسلامی اور دینی فکر کا کارواں کسی بھی مرحلے میں غیر مسلموں کے تعاون پر انحصار نہ کرے۔ غیر مسلم قوتوں کے تعاون سے کسی "اسلامی جنگ" اور اسلامی فتح جیسی خطرناک اور گمراہ کن خوش خیالی سے بچا جائے۔ گو مخصوص حالات میں معاہدے ہو سکتے ہیں مگر اسلامی قوتوں کو فیصلہ کن سمجھتے اور ان کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے۔(41)
- مسلم عوام کی کلی حمایت کے حصول کے لیے علامتوں اور نعروں کا استعمال کیا جا سکتا ہے اور ہر زمانے میں کوئی ایسی علامت دریافت کی جا سکتی ہے جس سے دلوں کے تار بج اٹھیں اور مسلمان پوری قوت سے انقلاب اسلامی کی مہم کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔ البتہ اس سے قبل ایک ایسے نظام کی تربیت و تشکیل ضروری ہے جو اس عوامی قوت کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکے۔ ساتھ ہی اس کے اندر برپا کردہ تبدیلی کو سہارنے اور اسے استحکام بخشنے کی پوری قوت بھی موجود ہو۔

- احیائے دین اور انقلاب اسلامی کے علمبرداروں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ دعوے سے اپنے کام کا آغاز کریں، کہ یہ طریقہ انبیاء کے لیے مخصوص ہے مصلحین اور مجددین کے لیے اس میں فائدے کم اور نقصانات زیادہ ہیں۔
- امت مسلمہ کے اندر کسی مصنوعی طریقہ سے جماعت سازی یا گروہ بندی سے احتراز کیا جائے، کہ یہ عمل اپنے خول میں بند کرتا اور اپنی دنیا میں مگن رہنے کا فن سکھاتا ہے۔ البتہ امت واحدہ یعنی الجماعت کے احیاء کی کوشش کی جائے اور اسے ایک انقلابی نظریاتی گروہ کی حیثیت سے محرک کر دینے کے لیے سر توڑ جدوجہد کی جائے۔

کارکنان میں شہادت کے لیے بلا کا عشق اور اس کے حصول کے لیے انتہائی درجے کی بے چینی پیدا کی جائے۔ کاروان انقلاب امت کا یہ اول اور آخر نکتہ ہے، یہ دیوانوں کے اس گروہ کی پہلی اور آخری خاصیت ہے اور جب تک یہ خاصیت اس عظیم انبیائی مشن کے حاملین میں پیدا نہ ہو انقلاب اسلامی کا کارواں کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ عصر حاضر میں احیائے اسلام کے بینر تلے کام کرنے والی بے شمار تحریکوں اور اداروں کی ناکامیابی کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ (42)

حوالہ جات وحواشی

1۔ ڈاکٹر مبارک علی، برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ، فکشن ہاؤس، لاہور، 1997ء، ص109
2۔ ایضاً، ص110
3۔ ایضاً، ص110
4۔ ڈاکٹر مبارک علی، برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ،، ص308
5۔ نیازی، سید نذیر، تشکیل جدید السہیات اسلامیہ، بزم اقبال، لاہور، 1958، ص229
6۔ بھٹی، امان اللہ، ڈاکٹر، اسلام اور خانقاہی نظام، ص314
7۔ ندوی، ابوالحسن علی، مغرب سے کچھ صاف صاف باتیں، لکھنو مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، 1977، ص26
8۔ برق، غلام جیلانی، ڈاکٹر۔ الحاد مغرب اور ہم، ص105
9۔ بھٹی، امان اللہ، ڈاکٹر، اسلام اور خانقاہی نظام، ص318
10۔ شہید، سید قطب، اسلام اور مغرب کے تہذیبی مسائل، لاہور، میٹرو پرنٹرز، 1981، ص44
11۔ اقبال، علامہ، حکیم الامت، بانگ درا، لاہور، یونائیٹڈ چوک انارکلی، 1945، ص214
12۔ بھٹی، امان اللہ، ڈاکٹر، اسلام اور خانقاہی نظام، ص320

13۔ فاروقی، برہان، احمد، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، لاہور، علم و عرفان پبلیشرز، 1999ء، ص109
14۔ بھٹی، امان اللہ، ڈاکٹر، اسلام اور خانقاہی نظام، ص322
15۔ مودودی، ابوالاعلیٰ، مولانا، تنقیحات، ص300
16۔ القرآن:85:02
17۔ ایضاً
18۔ فاروقی، برہان احمد، ڈاکٹر، قرآن اور مسلمانوں کے زندہ مسائل، علم و عرفان پبلیشرز لاہور، ص100-101
19۔ القرآن، البقرہ:07
20۔ ایضاً، ص280-281
21۔ مولانا ابو الحسن علی ندوی، انسانی علوم کے میدان میں اسلام کا انقلابی و تعمیری کردار، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ 1988، ص28-29
22 ۔ V.D.Mahajan, Muslim Rule In India, Schan Publishing, Dehli, 1970, P34-35
23۔ رحیم الدین، شیخ، مولانا، ملفوظات ڈاکٹر اسرار احمدؒ، لاہور، مکتبہ خدام القرآن 2015، ص65
24۔ عزیز، احمد، پروفیسر، ہندو پاک میں اسلامی کلچر، دہلی، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس،، 1991ء، ص109
25۔ ڈاکٹر اسرار احمد، موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل، ص52
26۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال، اور مستقبل، ص46-47
27۔ ایضاً، ص50
28۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال، اور مستقبل، ص51
29۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل، ص52
30۔ عزیز احمد، پروفیسر، ہندو پاک میں اسلامی جدیدیت، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ص361
31۔ اسرار احمد، ڈاکٹر، سابقہ اور موجودہ مسلمان امتوں کا ماضی، حال اور مستقبل، ص54
32۔ ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد 21، شمارہ 1، جنوری 2009ء، ص50
33۔ سالک، عبدالمجید، ذکر اقبال، دہلی، چمن بک ڈپو، 1955، ص265
34۔ ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد 21، شمارہ 1، ص53
35۔ ایضاً، ص55
36۔ ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد 21، شمارہ 1، ص55-56

37۔ ایضاً، ص57

38۔ ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد 21، شمارہ 1، ص57-58

39۔ ایضاً، ص58

40۔ ماہنامہ اشراق، لاہور، جلد 21، شمارہ 1، ص58

41۔ شاز، راشد، غلبہ اسلام، علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز، 1987، ص38

42۔ شاز، راشد، غلبہ اسلام، علی گڑھ، انسٹی ٹیوٹ آف مسلم امہ افیرز، 1987، ص39